بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محض حرکت ممکن ہے ایک آوارہ و سرگرداں آدمی کے لیے کسی مسرت کا موجب ثابت ہوتی ہو مگر یہ اُس شخص کے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتی جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد اور نصب العین رکھتا ہے۔ ایک بامقصد انسان اس کی افادیت یا قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوتے ہمیشہ منزلِ مقصود کو نگاہ میں رکھے گا۔ اگر یہ حرکت اُسے منزل کے قریب لے جانے والی ہو تو وہ صد مبارک ہے لیکن اگر اس حرکت سے منزل کھوٹی ہوتی ہو تو پھر یہی اس کے لیے وجہ تشویش اور اضطراب بن جاتی ہے۔

قریب قریب یہی حال اقوام و ملل کا بھی ہے۔ وہ قومیں جو دنیا میں بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اُن کے لیے صرف "برق و بخارات" کی ترقی، روپے کی ریل پیل، عیش و عشرت کے زیادہ سے زیادہ مواقع اطمینان کا موجب ہوتے ہیں لیکن ان کے برعکس وہ قومیں جو اپنے سامنے لغائی نصب العین رکھتی ہیں، جن کے پیشِ نظر روحانی مقاصد ہوتے ہیں اُن کے لیے محض اس مادی ساز و سامان کی فراوانی کچھ تسلی بخش نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اس کی زیادتی انہیں مضمحل اور پریشان کرنے کا باعث بنتی ہے۔ حضرت عمر بن عوفؓ سے روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کو جزیہ لینے کے لیے بحرین بھیجا۔ وہ بحرین سے مال لیکر آئے۔ انصار نے سنا کہ حضرت ابو عبیدہ آگئے تو وہ صبح کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتے جب آپ نماز سے فارغ ہو چکے تو وہ سامنے آئے، آپ انہیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا میرا خیال ہے تم نے سن لیا، ابو عبیدہؓ بحرین سے کچھ لاتے ہیں۔ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: مبارک ہو اور خوشی کی امید رکھو، خدا کی قسم میں تمہارے لیے فقر کو وجہِ تشویش نہیں سمجھتا لیکن تمہارے بارے میں مجھے یہ

خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے لیے بھی دنیا اس طرح نہ پھیلا دی جائے جیسے تم سے پہلے لوگوں کے لیے پھیلائی گئی تھی تو جیسے اُن کو ہلاک کیا تم کو بھی کہیں ہلاک نہ کر دے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مال و متاع کی زیادتی اسی صورت میں مبارک ہے جب اس سے اصل منزل سے انحراف نہ ہوتا ہو لیکن اگر اس کی محبت میں گرفتار ہو کر مسلم قوم خود اسے ہی اپنا معبود اور کعبۂ مقصود بنا بیٹھے اور جس طرف فی الواقع اُس کا نصب العین ہے اس سے بالکل الٹی سمت میں بڑھنے لگے تو پھر یہی دولت اُس کے لیے ہلاکت اور بربادی کا پیغام ہے۔ اس کی افزائش سے پھر اُس کے اندر مسرت و شادمانی کی لہر دوڑنے کی بجائے تشویش و اضطراب کے جذبات نمودار ہونے چاہئیں

مال و دولت، اولاد، کھیتیاں اور باغات سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ کوئی قوم انہیں اللہ کی حدود کے اندر رہ کر استعمال کرے اور ان کی مدد سے اپنے اُس فرض سے سبکدوش ہونے کی فکر کرے جو شاہد علی الناس کی حیثیت سے اُس کے خالق نے اُس پر عائد کیا ہے۔ اگر یہ دنیاوی اسباب اس کرۂ ارضی میں منکرات کے استیصال کا ذریعہ بنیں اور معروف کے پروان چڑھانے میں ان سے کام لیا جاتا ہو تو پھر یہ خداوند تعالیٰ کے انعامات ہیں لیکن اگر ان سے ادائے فرض میں کوتاہی ہوتی ہو یا نصب العین سے قدم دور ہٹتے ہوں تو یہ سب فتنے ہیں جن سے ایک خدا پرست قوم کو ہمیشہ خبردار رہنا چاہیے اور ان سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے۔

آپ اس معاملہ پر جتنا زیادہ غور کریں گے آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کے لیے نصب العین کا وجود اور اس سے وابستگی نہ صرف اُس کے لیے مادی مال و اسباب کی اہمیت متعین کرتی ہے بلکہ وہ حرکت کے سارے مظاہر کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی صرف اسی ایک پیمانے سے لگاتی ہے یہی وہ بنیاد ہے جس سے ایک با مقصد قوم ترقی و تنزل، عروج و زوال، خوشحالی

وبدحالی، قوت و بے بسی کا صحیح صحیح مفہوم اپنے دل و دماغ میں بٹھاتی ہے۔ اگر نصف النہار آنکھوں سے اوجھل ہو جائے یا اس کے لیے دلوں میں کوئی کشش باقی نہ رہے تو پھر یہ سارے الفاظ حروف کے بے معنی پیکر ہیں جنہیں ہر انسان اپنی خواہشِ نفس سے جو معانی چاہے بڑی آسانی کے ساتھ پہنا سکتا ہے۔

امتِ مسلمہ کے اندر آج جو فکری انتشار اور عملی بے راہ روی نظر آتی ہے اُس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ اُس کا اپنے آئیڈیل سے وہ تعلقِ خاطر باقی نہیں رہا جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ اُس کے ایک بااثر طبقے نے اپنی قوم کے لیے بھی اُسی مقصد کو اپنا لیا ہے جو اس وقت مغربی اقوام کے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کی روشنی میں وہ اقدارِ حیات متعین کرتا ہے، اسی کے مطابق وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف مسائل کو حل کرنے کی فکر کر رہا ہے۔ لیکن اپنے اس طرزِ فکر پر وہ اسلام کا لیبل لگانے پر آپ اپنے آپ کو اس لیے مجبور پاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ایسا کیے بغیر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ اس کے نزدیک قومی ترقی کا مفہوم یہی ہے کہ مغربی دنیا کی طرح یہاں بھی مال و دولت کی فراوانی ہو، عظیم الشان عمارات ہوں، بڑے بڑے بنک اور کارخانے ہوں۔ اسی طرح آزادی سے اس کی مراد یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں میں آزادانہ میل جول ہو اور مذہب نے حسن و نظر کے درمیان جو پردے حائل کر رکھے ہیں انہیں یکسر ختم کر دیا جائے۔ الغرض مغرب کی نظر میں جو چیزیں روشن خیالی سمجھی جاتی ہیں انہیں یہاں رواج دیا جائے اور ہر اُس چیز کو مٹایا جائے جو اس راہ میں حائل ہوتی نظر آئے۔

مغربی اسلوبِ حیات کو اسلامی آئیڈیل کے ساتھ اپنانا چونکہ ناممکن سی چیز ہے اس لیے اب اس کی عملی ترکیب یہ نکالی گئی ہے کہ جوں توں کر کے خود اسلام کو اس حد تک بدل دیا جائے کہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی وجہِ امتیاز باقی نہ رہے۔ اور اسلام بھی مغربی تہذیب کی ایک

نہایت ترقی یافتہ صورت دکھائی دینے لگے۔ یہی وہ اصل وجہ ہے کہ اب اسلام سے ایسی ایسی چیزوں کا جواز نکالا جا رہا ہے جنہیں یہ دین اس دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے آیا تھا۔ کبھی ہم یہ سنتے ہیں کہ یہ سود جو پیداآوری کاموں کے لیے لیا جاتا ہے یہ بالکل حلال اور طیب ہے اور مسلمانوں کو اسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کبھی ہمارے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ گانے بجانے سے آدمی کو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے اس لیے اس کا پورا پورا التزام ہونا چاہیے۔ کبھی مصوری کو شیوۂ پیغمبری ثابت کیا جاتا ہے، کبھی پردہ کو ایک جاہلانہ رسم بتایا جاتا ہے، کوئی صاحب اٹھتے ہیں تو وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے سارے معتقدات پر ہاتھ صاف کرنے لگتے ہیں اور ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ جنت و دوزخ، حشر و نشر سب اعتباری باتیں ہیں جو عربوں جیسی جاہل قوم کے لیے تو قابلِ قبول ہو سکتی تھیں لیکن ان پر آج ایمان نہیں لایا جا سکتا، کوئی طبقہ ہمیں افلاس سے ڈرا کر تحدید نسل پر آمادہ کر رہا ہے۔ یہی اور اسی قسم کے سینکڑوں ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں اسلام سے سندِ جواز حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں ہو رہی ہیں۔

آپ ان سارے مسائل کا مطالعہ کریں اور پھر تجزیہ کریں کہ ان میں سے کتنے فی الواقع ہمارے قومی مسائل ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو غیر ملکی سامانِ تعیش کی طرح ہم بلا ضرورت درآمد کر رہے ہیں۔ ان مسائل کی لمبی فہرست میں پچاس فیصد وہ ہیں جن سے ہماری قوم کا دُور کا بھی تعلق نہیں۔ وہ نہ تو اس کی فطرت کے مطالبات اور تقاضے ہیں اور نہ ہی اس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں بلکہ انہیں جب بھی ہماری معاشرت میں ہماری خواہش کے علی الرغم داخل کیا جاتا ہے تو سوسائٹی کی عظیم اکثریت متوحش ہو جاتی ہے۔ اور قوم کے بااختیار طبقے کو انہیں ملت پر ٹھونسنے کے لیے شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کشمکش میں ہمارے اندر جو فکری خلفشار پیدا ہو رہا ہے اس کے متعلق پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات کی پیداوار نہیں بلکہ بعض

ناعاقبت اندیش مغرب پرستوں کی فکری بے راہ روی کا افسوسناک انجام ہے کیا مصوری ہمارا قومی مسئلہ ہے اور اس کی طرف سے تغافل ہمارے لیے وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ کیا رقص و سرود کی محفلیں ہماری ملی ضروریات ہیں اور ان کے بارے میں عدمِ توجہی ہمارا ایک ناقابلِ برداشت قومی زیاں ہے؛ کیا شرم و حیا عفت و عصمت نے ہمارے لیے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر رکھے ہیں اور ہم انہیں حل کرنے کے لیے یہاں بے حجابی کو فروغ دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ آپ سوچیے کہ ان میں سے آخر کونسے ایسے مسائل ہیں جن پر ہماری قومی ترقی کا دارومدار ہے۔ اور اگر اُن کے بارے میں ہم نے مغربی طرزِ فکر کو اختیار نہ کیا تو ہم لازمی طور پر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

باقی رہے زندگی کے وہ مسائل جو ماحول کے آفریدہ ہیں اور جن میں فی الحقیقت مسلم قوم مختلف قسم کی الجھنیں محسوس کرتی ہے، ان کے حل کرنے کے لیے بھی ہم نہ تو وہ اندازِ فکر رکھتے ہیں اور نہ ہی اپنے اندر وہ جرأت پاتے ہیں جو ایک بامقصد قوم کا طغرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ہماری روش بڑی ہی غلط اور احمقانہ ہے۔ ہم بدقسمتی سے یہ فرض کر بیٹھے ہیں کہ خواہ دنیا کی کوئی قوم ہو اُس کے فکر و نگاہ کے زاویے خواہ کسی انداز کے ہوں، اس کے سامنے مقاصد لازماً وہی ہونے چاہییں جو اس وقت کی مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کے پیشِ نظر ہیں۔ اور اس وجہ سے عروج و زوال، خوشحالی اور بدحالی کا معیار بھی نتیجتاً وہی ہونا چاہیے جو ہمیں مغرب سے ملا ہے۔ اس لیے اب امتِ مسلمہ کی بقا اور ترقی کا راز بھی صرف اسی چیز میں مضمر ہے کہ ہم کسی طرح آن ساری چیزوں کو اپنا لیں جن کو دنیائے مغرب اختیار کر چکی ہے۔ ہماری ساری کوششیں اس وقت صرف اسی ایک مرکز پر مرکوز ہیں اور اسی کو ہم فلاحِ امت سمجھتے ہیں۔

اس طرزِ فکر کے حاملین اپنی ساری فلسفہ طرازیوں کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو سمجھنے سے

قاصر ہیں کہ دریا کا دھارا دریا کے رُخ پر بہنے سے تو نہیں بدلا جاتا۔ اس کا تبدیل کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہے جو زبردست ایثار اور قربانی کا طالب ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ماحول سے لڑ جانے کی ہمت اور عزم رکھتے ہوں، جو مغربی تہذیب و تمدن کی ساری برکتوں سے محروم ہونے پر آمادہ ہوں اور ہر بڑی سے بڑی مصیبت کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آپ دنیا کی تاریخ پر ایک نگاہ دوڑا لیجیے اور دیکھیے کہ دنیا میں کتنے انقلابات ایسے آئے ہیں جو افکار و نظریات کی سودابازی کے رہینِ منت ہیں۔ انقلاب جب کبھی آتا ہے تو عزمِ صمیم کے ساتھ آتا ہے اور اس کے پیچھے وہی ذہن کام کرتا ہے۔ جو مداہنت کی ہر اپیل کو ٹھکرا دے، جو وقتی فائدہ و نقصان سے یکسر بے پروا ہو کر آگے بڑھے، اور جسے کوئی لالچ یا طمع اپنی روش سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو اور اس کے سامنے جب بھی کبھی اس قسم کی کوئی صورت پیش کی جاتی تو وہ پکار اُٹھے: "یہ تو معمولی چیزیں ہیں تم اگر آسمان سے چاند اور ستارے بھی نوچ لاؤ، پھر بھی میں اپنے اس مشن کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں جسے میرے ضمیر اور ایمان نے صحیح اور برحق کہا ہے"

دنیا کی ہر انقلابی قوم سود و زیاں کا تعین اپنے مقاصد کی روشنی میں کرتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مغرب کے لیے جو چیز بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ ہمارے لیے بالکل غیر اہم بلکہ مضرت رساں ہو اور دوسرے جس چیز کے حصول کے لیے بیتاب نظر آئیں ہم اسے اپنے ہاں سے جلد از جلد مٹانے کے آرزومند ہوں۔

آپ اسی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔ یورپین اقوام کے دل و دماغ پر اس وقت جو نظریہ مستولی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی فلاح و کامرانی کا معیار صرف مال و دولت ہے جس قوم کے پاس اس کی فراوانی ہے وہ قوم زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہے اور جس کے پاس اس کی کمی ہے وہ پسماندہ اور جاہل ہے۔ اب اسی ایک معیار پر اُن کی اقدارِ حیات مرتب

ہوتی ہیں، اور اسی کے مطابق ان کے خیر و شر کے نظریات ترتیب پاتے ہیں۔ اُن کے ہاں شرافت، اخلاق، ایثار، جرأت میں یہی تصور بطور بنیاد کام کرتا ہے۔ پھر انفرادی زندگی سے آگے نکل کر اجتماعی زندگی میں یہی چیز اُن کا رہنما اصول ہے۔ اُن کے قومی منصوبوں اور اسکیموں میں، اُن کی خارجی اور داخلی پالیسی میں الغرض اُن کی زندگی کے سارے شعبوں میں یہی مادی فلاح و بہبود کا فلسفہ آپ کو کارفرما نظر آئے گا۔ اسی ایک مقصد کے حصول کے لیے وہ قومیں زندہ ہیں اور اسی کے لیے وہ جان کی بازی لگانے پر تیار نظر آتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ جن اقوام کے مقاصد یہ ہوں اُن کی سعی و جہد کا انداز، اُن کی معاشرتی زندگی کے ڈھانچے، اُن کے معاشی پروگرام اور اُن کے سیاسی عزائم کبھی بھی وہ نہیں ہو سکتے جو ایک اخلاقی اور روحانی نصب العین رکھنے والی قوم کے ہوتے ہیں۔ منزل کا فرق بالکل فطری طور پر تدبیرِ منزل کے اختلاف پر منتج ہوتا ہے۔ آپ اگر صرف دولتمند بننا چاہیں تو آپ کی کوششوں کی نوعیت دوسری ہوگی اور اس کے برعکس اگر آپ کا اوّلین مقصد علم کا حصول ہے تو پھر آپ کا دائرۂ کار بالکل جداگانہ ہوگا۔

ہمیں جو اس قسم کی الجھنیں درپیش ہیں اُن کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم اسلام کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتے اور مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کرنے کے بھی شدید آرزو مند ہیں۔ اگر ہم اپنے مقصد کے معاملے میں یکسو ہوتے تو اس قسم کی کوئی مصیبت ہمیں پیش نہ آتی۔

فقر کے خوف سے تحدیدِ نسل کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ دنیا جب سے قائم ہوئی ہے اسی وقت سے لیکر آج تک انسانی آبادی کے مقابلے میں خوراک ہمیشہ کم رہی ہے اور اسی وجہ سے انسان نے اسے حاصل کرنے کی مسلسل جد و جہد کی ہے۔ اسی کو بڑھانے کے لیے زمین کے سینے کو چاک کیا گیا۔ اس میں بہتر کھاد اور بیج ڈالے گئے، آبپاشی اور کاشت کاری کے نئے نئے تجربات ہوتے اور زراعت کی دنیا میں عجیب و غریب ایجادات ہوئیں۔ آبادی

کے مقابلے میں اگر رزق کی فراوانی ہوتی تو انسان کبھی کوشش نہ کرتا۔ یہ اسی کمی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کو اس میدان میں کھپایا ہے اور خوراک کی مقدار میں حیرت انگیز اضافہ کیا ہے۔ یہی مسئلہ حضور سرورِ دو عالم کے زمانے میں بھی اہلِ عرب کو درپیش تھا۔ اُس دور کے مسلمان مالی لحاظ سے کچھ بہت زیادہ خوشحال نہ تھے۔ لیکن اس وقت چونکہ اُن کے سامنے جو مقاصد تھے اُن کی نوعیت سراسر روحانی اور اخلاقی تھی اس لیے انہوں نے کبھی کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کی جس سے ان مقاصد کو نقصان پہنچے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کا کارواں کبھی بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اگر وہ اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوں۔ اس لیے انہوں نے سب سے زیادہ زور اخلاق کی حفاظت اور پاسبانی پر دیا۔ نکاح کے زیادہ سے مواقع فراہم کیے گئے تاکہ قوم کو زنا کی لعنت سے بچایا جائے۔ چونکہ اُن کے سامنے نصب العین نہایت واضح اور صاف تھا اس لیے تعددِ ازواج کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہونے والے تھے وہ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔

اسی طرح سودی کاروبار کا بھی قلع قمع کیا گیا اور اس بات کی مطلق پروانہ کی گئی کہ اس سے مسلمانوں کو کس حد تک مالی نقصان اٹھانا پڑ گیا۔ اُن کی نگاہ ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رہتی تھی اور جو چیزیں اس راہ میں مزاحم ہونے والی تھیں وہ انہیں فوراً راستے سے ہٹا دیتے تھے۔

یہی مسائل آج دیکھیے ہمارے لیے کس قدر موجبِ پریشانی ہیں۔ ہم پر غربت کا خوف اس بُری طرح سے مسلط کیا جا رہا ہے کہ ہم ہر اُس تدبیر کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہیں جس سے اس مصیبت کو ٹالا جا سکے، خواہ اس تدبیر سے ہم منزل سے دُور ہوتے جا رہے ہوں۔ اس خوف و ہراس کے عالم میں ہم غالباً بھول چکے ہیں کہ یہ غربت و امارت بھی اضافی باتیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ روپے کی فراوانی اگر ایک قوم کے لیے عزت کی علامت ہے تو دوسری بھی لازمی طور پر اسے یہی حیثیت دیتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جب کبھی کسی قوم کے سامنے کچھ مسائل آتے ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ بھی انہیں اسی طرح حل کرے جس طرح دوسری قوموں نے کیا ہے۔ دنیا کی ہر زندہ قوم ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں طریقوں کو اختیار کرتی ہے جو اس کے مقاصد کے مطابق ہوں۔ بعض قوموں نے سودی کاروبار کو فروغ دیکر اپنے معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے برعکس دنیا میں بعض ایسی قومیں بھی ہیں جنہوں نے اس لعنت کو ختم کرکے اپنے معاشی معاملات کو بہتر بنایا ہے۔ اس طرح افزائش آبادی کا بھی مختلف قوموں پر مختلف ردعمل ہوا ہے۔ بعض نے تحدیدِ نسل کا طریقہ اختیار کیا۔ بعض نے خوراک میں اضافہ کرنے کی فکر کی بعض نے غیر آباد زمینوں کو آباد کیا اور بعض ایسی بھی تھیں جنہوں نے اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اپنے سارے معاشرتی اور معاشی ڈھانچوں کو بدل کر رکھ دیا اور اس طرح ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی۔

آج اگر ہم دنیا میں ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے علمبردار کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنے مقاصد سے لگن پیدا کرنی چاہیے اور پھر اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہماری ساری کوششوں کا محور و مرکز صرف خدا کی رضا ہو اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہم جد و جہد کریں۔ آخر ہم نے اس بات کو کیوں فرض کر لیا ہے کہ خیر لازمی طور پر وہی ہے جسے اہلِ مغرب خیر کہیں۔ فلاح و کامرانی کا ہمیں اسلام نے ایک معیار دیا ہے اور ہمیں اسے اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔